مسلمانوں کی موجودہ قومی سیرت کے بعض کمزور پہلو

(از جناب مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی)

مسلمانوں پر تنقید کرنا اور ان کے کمزور پہلوؤں کو نمایاں کرنا کسی مسلمان کے لیے قطعاً کوئی خوش گوار کام نہیں ہے اور اس کے لیے کوئی شخص آسانی سے تیار نہیں ہو سکتا، لیکن دنیا کے سب ضروری کام خوشگوار نہیں ہوتے۔ ایک ایسی جماعت کی کمزوریوں کو خاموشی سے دیکھتے رہنا جس سے نہ صرف اس کی اپنی قسمت بلکہ دنیا کی قسمت بھی وابستہ ہے اور جو انجیل کی زبان میں زمین کا نمک ہے جس کی نمکینی کے ضائع ہو جانے کے بعد پھر زمین کو کوئی چیز نمکین نہیں کر سکتی، ایک ایسا ناخوش گوار کام ہے جس کے مقابلہ میں دنیا کی ہر ناگواری، ہر تلخی، ہر طرح کی روحانی اذیت اور ہر قسم کی ذہنی کوفت ہیچ ہے، اور اس کے مقابلہ میں اپنی یا دوسروں کی یہ ناخوش گواری کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

مسلمانوں کی کسی قوم یا ملک کا سلطنت و اقتدار سے محروم ہو جانا، یا مسلمانوں کا عالمگیر سیاسی زوال بہت بڑا حادثہ ہے جس پر جتنا ماتم کیا جائے کم ہے۔ اس کے جو اخلاقی اور ذہنی نتائج ہوتے ہیں، وہ بھی اب کچھ پوشیدہ نہیں رہے۔ لیکن اس سے بدرجہا المناک حادثہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کی ذہنیت یا نفسیت کسی ایسے سانچہ میں ڈھلنے لگے جو صحیح اسلامی تعلیم و تربیت کا سانچہ نہیں ہے، اور بعض انفرادی عیوب و نقائص یا منکرِ خدا اور منکرِ آخرت قوموں کے صفات و خصائص مسلمانوں کی سیرت کا جزء بننے لگیں اور قومی کیرکٹر کی صورت اختیار کرنے لگیں۔ تحریفِ دین کی اصطلاح تو پہلے سے موجود ہے اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ عملی کوتاہیوں اور ذاتی انحراف سے بڑھ کر کوئی جماعت اصلِ دین، اس کی کتابوں اور اس کی تعلیمات میں ترمیم و تنسیخ اور ردوبدل شروع کر دے۔ اس کے نتائج انحراف سے کہیں بڑھ کر خطرناک اور وسیع ہوتے ہیں، اور اس کا علاج اور اس صورتِ حال کی اصلاح تقریباً محال ہوتی ہے، اس لیے کہ اس

تحریف سے اس قوم کے ذہن میں حقائق بدل جاتے ہیں، گناہ عین صواب اور بعض اوقات کار ثواب بن جاتا ہے اور ان کو دین کی اصل و حقیقت سے ہٹ جانے یا دور پڑ جانے کا احساس ہی نہیں ہوتا، بلکہ وہ جو کچھ کرتے ہیں وہی عین دین معلوم ہوتا ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں میں مذہبی طور پر یہی صورت پیش آئی۔ میں اس تحریفِ دین کے مقابلہ میں اس ذہنی و اخلاقی تبدیلی کو جو ہندوستان کے مسلمانوں میں نظر آ رہی ہے تحریفِ مسلمین سے تعبیر کروں گا۔ مسلمانوں میں عملی کوتاہیاں کم و بیش ہمیشہ پائی گئیں اور انسانوں کی کسی جماعت کا ان سے یکسر پاک ہونا بہت مستبعد ہے۔ لیکن یہ انحراف تھا۔ مسلمان اس کو غلط سمجھتے رہے اور اسلامی ذہن و ضمیر ہمیشہ اس کے خلاف احتجاج کرتا رہا، اور کبھی مسلمانوں نے اس پر فخر نہیں کیا۔ لیکن اب جو کچھ نظر آ رہا ہے اس کو انحراف کہنا مشکل ہے، وہ اس سے کچھ زیادہ وسیع اور عمیق اور اس سے مختلف شکل رکھتا ہے۔ یہ مسئلہ مسلمانوں کے تمام سیاسی، تعلیمی اور اقتصادی مسائل سے زیادہ اہم اور قابلِ توجہ ہے۔ قومی کیرکٹر ہر قوم کی زندگی میں اس کی مادی دولتوں سے کہیں بڑھ کر بیش قیمت ہوتا ہے۔ بالخصوص مسلمانوں کی اسلامی سیرت، بڑی سے بڑی اسلامی سلطنت اور بڑے سے بڑے قومی ادارہ اور زیادہ سے زیادہ قومی ترقی اور اقتصادی خوش حالی سے زیادہ قیمت رکھتی ہے۔ کسی بڑی سے بڑی قیمت اور عظیم سے عظیم بدل پر بھی اس کے نقصان یا زوال کو گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس پر زوال آ گیا یا اس میں کچھ غلط تبدیلی واقع ہو گئی تو بڑی سے بڑی مادی کامیابی اور فتح سے اس کا کفارہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تبدیلی مختلف تاریخی و سیاسی و تعلیمی و تہذیبی اسباب، بعض موثر اور اشتعال انگیز حالات و واقعات اور زیادہ تر قیامت کی گزرتی سے صدیوں میں پیش آتی ہے۔ لیکن جب بدقسمتی سے یہ تبدیلی واقع ہو جاتی ہے تو صدیوں تک اس کا اثر قائم رہتا ہے اور اس کے اخلاقی و اجتماعی نتائج اس قوم کے تمام افراد کو برداشت کرنے پڑتے ہیں خواہ انفرادی طور پر بعض افراد کتنے ہی نیک سیرت ہوں۔

اس موقع پر چند نمایاں کمزور پہلوؤں کا ذکر کیا جاتا ہے جو دینی و اخلاقی حیثیت سے زیادہ اہمیت

رکھتے ہیں اور جن کو اصل اسلامی سیرت اور اخلاقی تعلیمات سے زیادہ بُعد اور تعارض ہے۔

(۱) ایک نہایت اہم اور گہری اور انقلاب انگیز تبدیلی جو مسلمانوں کی ذہنیت و نفسیات میں اس پچاس سال کے اندر اندر واقع ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ آخرت پر ایمان عملاً کمزور ہوتا چلا جا رہا ہے، اور اس کے نتیجہ کے طور پر یا مستقلاً اصول اور صداقت کے مقابلہ میں منافع و مصالح، آجل کے مقابلہ میں عاجل کو ترجیح دینے کا مرض پیدا ہو گیا ہے۔ اس سے مسلمان ایک با اصول، بلند اخلاق، پختہ سیرت جماعت کے بلند مقام سے گر کر ایک بے اصول، ناقابلِ اعتبار، ابن الوقت اور مصلحت پرست قوم کی ادنیٰ سطح پر آتے جا رہے ہیں جس کے سامنے کوئی اخلاقی معیار نہیں ہے بلکہ صرف منافع و مصالح اور اغراض و مقاصد ہیں۔ یہ تبدیلی اُس وقت شروع ہوئی جب ہندوستان میں اور تقریباً تمام اسلامی ممالک میں (جو کسی طرح یورپ کے زیرِ اثر آئے) مسلمانوں کو مغربی تہذیب، مغربی فلسفۂ اخلاق اور مغربی معیاروں کے قبول کرنے کی دعوت دی گئی۔ مغربی اخلاق، فلسفہ، علوم اور سیاست کا ہر طالب علم اور اس زمانہ کا ہر واقف آدمی جانتا ہے کہ یورپ کا سارا نظامِ زندگی تمام تر مادہ پرستی اور مصلحت جوئی پر مبنی ہے۔ "افادیت" اور "مصلحت بینی" اس نظامِ زندگی کے ریشہ ریشہ میں سرایت کر چکی ہے۔ سارا یورپ اُس وقت سے جب سے اس نے کلیسا کے اقتدار سے اپنے کو آزاد کرایا صرف ایک ہی عملی مذہب رکھتا ہے (جس کے خلاف کسی گوشہ میں بھی عملاً کوئی بغاوت نہیں ہے) اور وہ مذہب مادہ پرستی ہے۔ مسلم ممالک میں اس نظام کے غلبہ کا طبعی نتیجہ یہ ہے کہ آخرت کی اہمیت کم ہوتے ہوتے بعض حلقوں (میں جہاں یہ نظام اپنی پوری روح کے ساتھ مستولی ہے) معدوم ہو گئی ہے۔ دنیاوی ترقی اور مادی فوائد و منافع منتہائے نظر بن گئے ہیں۔ اصولی و اخلاقی معیار منافع و فوائد کے مقابلہ میں اپنی اہمیت بالکل کھو چکے ہیں۔ مسلمانوں میں اس دعوت کے علمبرداروں نے ترقی (یعنی دنیاوی ترقی) پر اتنا زور دیا اور اس شد و مد اور بلند آہنگی سے مادی ترقی کی دعوت دی کہ بالارادہ یا بلا ارادہ آخرت اور امورِ آخرت کی اہمیت کم ہو گئی، بلکہ بعض اوقات انھوں نے اس نظام اور ان افکار کی تضحیک و تنقیص

کی جس میں دنیا کے مقابلہ میں آخرت کی اہمیت زیادہ تسلیم کی گئی تھی اور مسلمانوں کو دنیا پرست اور آخرت سے غافل ہونے سے روکنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اُن جملوں اور اُن تقریروں اور تحریروں کا مذاق اُڑایا گیا اور ان کی ہجو کی گئی جن میں دنیا کو متاعِ قلیل اور متاعِ غرور کہا گیا تھا۔ دنیا پرست ، مادہ پرست اور منکرِ آخرت قوموں اور ملکوں (غالباً صحیح تر ایک قوم اور ملک) کو مسلمان نوجوانوں کے سامنے ایک بلند نمونہ اور معیارِ کامل کے طور پر پیش کیا گیا جو ہر تنقید سے بالاتر تھا۔ پھر جو نظامِ تعلیم قائم کیا گیا اس میں انکارِ آخرت کی روح بسی ہوئی تھی، اس کی اساس اخلاق کے مقابلہ میں ظاہری منافع کی ترجیح پر رکھی گئی تھی، اس میں شرافت اور اخلاق کے مقابلہ میں خواہشِ نفس اور لذت کا عنصر غالب تھا، وہ تمام تر ایسی قوم اور ایسی تہذیب کے ذہن کی پیداوار تھا جو سرتاپا منکرِ آخرت تھی۔ دراصل یہ کسی مجرد نظامِ تعلیم کی قبولیت کی دعوت نہ تھی اور نہ ایسا ممکن ہے بلکہ یہ ایک پوری تہذیب، تمدن و معاشرت اور اخلاق و فلسفۂ اجتماع کی دعوت تھی۔

پھر اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ انھوں نے مسلمانوں کو صاف صاف ہوا کے رُخ پر چلنے اور دریا کے بہتے ہوئے دھارے پر کشتی چھوڑ دینے کی دعوت دی اور صاف صاف کہا کہ

"چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی"

اور ع "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز"

اس دعوت و تبلیغ میں مسلمانوں کی بہترین قابلیتیں صرف ہوئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی نظروں میں اصول و اخلاق کی اہمیت بتدریج گھٹتی چلی گئی اور بڑی تعداد میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جس کے نزدیک اخلاق و مصالح میں کوئی تقابل نہ تھا اور ہر موقع پر مصلحت کو اصول پر ترجیح حاصل تھی۔ وہ ہر وقت بڑے سے بڑے مذہبی اصول، شرعی حکم اور اخلاقی تعلیم کو ایک شخصی منفعت یا قومی مصلحت پر قربان کرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک خاص قسم کی محدود معاشی ترقی کے ساتھ ایک عام اخلاقی انحطاط اور بے اصولی پھیل گئی۔ بیسویں صدی کے اس نصفِ اول میں ہندوستان میں ہمیں مسلمانوں کے کیرکٹر میں

پہلے کے مقابلہ میں نمایاں اور محسوس انحطاط نظر آرہا ہے، جو ہر سوچنے سمجھنے والے مسلمان کے لیے حد درجہ تشویش ناک ہے۔ اب ایک اصول اور مذہبی اعتقاد کے مقابلہ میں ذاتی ترقی یا شخصی فوائد کی قربانی کی مثالیں کم سے کم تر نظر آتی ہیں اور وہ بھی زمانہ گذشتہ کی یادگاریں ہیں جو برابر رو بزوال ہیں۔ اب تمام مسائل زندگی پر ایک تعلیم یافتہ مسلمان کا طریق فکر اور زاویہ نگاہ خالص مادہ پرستانہ اور تاجرانہ ہے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ اس کام میں اس کے لیے کتنی مالی منفعت ہے یا اس کو کس قدر جاہ و اعزاز حاصل ہوگا اس بات سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ وہ شرعاً اس کے لیے جائز اور اخلاقاً مستحسن ہے یا نہیں بلکہ اس کا اپنا ضمیر بھی اس سے مطمئن ہے یا نہیں۔ یہ سوالات مسلمانوں کے دماغوں سے ایک عرصہ سے بالکل نکلتے جارہے ہیں یا ان کی اہمیت کم ہوگئی ہے اور ان کی بنا پر کسی مسلمان کو کسی عہدہ یا منفعت یا اعزاز کے قبول کرنے میں قلب و ضمیر کی رکاوٹ کم سے کم پیش آتی ہے خواہ وہ شریعت میں مطلقاً حرام اور اخلاقاً حد درجہ معیوب ہو اور اس کا ضمیر ایک لمحہ کے لیے بھی اس سے مطمئن نہ ہو۔ بلکہ اب اس کو ایک قومی خدمت سمجھا جاتا ہے اور اسی نقطۂ نظر سے اس کو دیکھا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ جو روپیہ کسی جائز یا ناجائز طریقہ پر کسی فرد کی جیب میں آتا ہے اور اس کے بچوں اور متعلقین کی خوش حالی کا سبب بنتا ہے وہ گویا قومی فنڈ میں جمع ہوتا ہے اس لیے کہ یہ سب مسلمان ہیں اور ایک مسلمان کی خوش حالی یا چند افراد کی خوش حالی خواہ وہ کسی قدر ذلت اور احکام مذہب کی صریح مخالفت کے بعد ہی ہو قومی خوش حالی کے مرادف ہے۔

اس ذہنیت و سیرت اور اس عام اخلاقی انحطاط اور کیرکٹر کی کمزوری کا اثر مسلمانوں کی زندگی کے تمام شعبوں پر پڑ رہا ہے اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کا عیب نظر نہیں آتا، بلکہ اس پر بحث کی گنجائش بھی بہت کم رہ گئی ہے۔ اس کا نتیجہ وہ عام بے اصولی، تناقض اور اخلاقی کمزوریاں ہیں جن کی مثالیں ہمیں ہر جگہ ملتی ہیں۔ ہمارے مسلمان اخبار و رسائل میں (الا ماشاء اللہ) ہر قسم کا خلافِ تہذیب اشتہار شائع کرایا جاسکتا ہے اگر اس کی قیمت ادا کر دی جائے۔ ادبی رسائل میں ہر قسم کے مخرب اخلاق،

حیاسوز و عریاں مضمون، افسانے، اشعار شائع ہو سکتے ہیں، بے حیائی اور اخلاقی بے نظمی کی ہر تحریک کے لیے وہ آلہ بن سکتے ہیں، بدتر سے بدتر فواحش کی اشاعت ان کے ذریعہ سے کی جاسکتی ہے اگر ان کو اس راستہ سے اپنے رسالہ کی کامیابی اور مقبولیت کا ایک فی صدی بھی امکان نظر آئے تو ایسی صورت میں وہ اس کی ہرگز پروانہ کریں گے کہ ان کی اس حرکت سے خلق خدا کی اخلاقی ابتری اور انحطاط کا ۹۹ فی صدی امکان ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان اخبارات و رسائل کے مالک وایڈیٹر ذاتی طور پر شریف مسلمان ہوں، اور وہ اصولاً ان چیزوں کو اچھا نہ سمجھتے ہوں لیکن اگر آپ اس مسئلہ پر اُن سے گفتگو کریں گے تو وہ صاف کہدیں گے کہ تجارت وصحافت میں اصول، مذہب اور اخلاق کی پابندی نہیں کی جاسکتی۔

اخبارات کسی اصول اور صحیح مسلک کی ترجمانی اور صحیح خیالات وافکار کی اشاعت کے بجائے اپنے قارئین اور عوام کے خیالات وخواہشات کی ترجمانی کو اصولِ صحافت سمجھتے ہیں۔ وہ عوام کی ناراضی اور بددلی کو ایک منٹ کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتے اور ان کی خوشی اور اپنے اخبارات کی مقبولیت و اشاعت کے لیے ہر قسم کی بے اصولی، ہر طرح کے تناقض اور ہر درجہ کے ابتذال کو گوارا کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے مذاق سلیم، فکر صحیح اور اخلاق قومی پر یہ اخبارات بڑی طاقت کے ساتھ اثر انداز ہیں اور مسلمانوں کے افکار وخیالات میں جو عام بے ربطی وتناقض، عام ذہنی انتشار اور اشتعال پذیری پائی جاتی ہے اس میں میرے نزدیک ان اخبارات کا بڑا حصہ ہے۔

مسلمان اہلِ علم اور اہلِ قلم کو آپ ہر کام پر لگا سکتے ہیں اگر اس کا خاطر خواہ معاوضہ آپ ان کو ادا کریں۔ ان سے خود ان کے خیالات وافکار کے خلاف سب کچھ کہلوا سکتے ہیں، لکھوا سکتے ہیں اور شائع کروا سکتے ہیں اگر اس کی قیمت ادا کر سکیں۔ بڑے بڑے سنجیدہ اور ذی علم اہلِ قلم واخبار نویس اور پُرجوش اسلامی نظمیں لکھنے والے شاعروں سے ایسے پروپیگنڈے کا کام لیا جاسکتا ہے جس سے وہ خود بھی متفق نہیں ہیں۔ اگر آپ اُن سے اس بارہ میں استفسار کریں گے تو وہ آپ کو جواب دیں گے کہ "اس میں کونسا مذہبی

یا قومی نقصان یا شرعی گناہ ہے؟ یہ تو ایک "بزنس" ہے۔ ایک شخص ہم کو معاوضہ دیتا ہے اور ہم اس کے بدلے میں اسے ایک تقریر یا مضمون تیار کر دیتے ہیں۔ گویا ضمیر فروشی بھی ایک شریفانہ تجارت ہے اور تعاون علی الاثم والعدوان (گناہ اور زیادتی پر مدد کرنا) خود کوئی گناہ نہیں۔ حالانکہ یہ دماغی وذہنی بیسوائی اُس بیسوا عورت کے گناہ سے بدتر ہے جو اپنا جسم کرایہ پر چلاتی ہے۔

جب سے مسلمانوں پر مغربی طرز کی قومیت کا غلبہ ہوا ہے وہ ہر چیز کو قومی ترقی اور قومی مفاد کے نقطۂ نظر سے دیکھنے لگے ہیں۔ اور جن چیزوں کا ارتکاب وہ ذاتی سربلندی اور شخصی منفعت کے لیے کرتے تھے اب اس کو قومی مفاد کے لیے ضروری سمجھنے لگے ہیں۔ مثلاً اب اُن کے لیے ضروری ہوگیا ہے کہ تمام محکموں اور شعبوں میں ان کا تناسب قائم رہے خواہ وہ آبکاری کا محکمہ ہو یا جاسوسی کا، سودی روبا کے نظام ہوں یا فی سبیل الشیطان لڑنے والے نظام۔ غضب یہ ہے کہ وہ کام بھی جس کی حرمت مسلمانوں کے لیے قرآن کی نصِ قطعی سے ثابت ہے اور جس پر قرآن کی یہ دو آیتیں شاہد ہیں؛

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِیْۤ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِیْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ قَالُوْۤا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِیْهَا فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا۔ (النسار)

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْۤا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ اِنَّ كَیْدَ الشَّیْطٰنِ كَانَ ضَعِیْفًا (النسار)

اس کو اسی قومی مفاد اور مسلمانوں کے تناسب اور ان کے قومی تفوق کو برقرار رکھنے کے لیے جائز قرار دیا گیا اور بعض مسلمانوں ہی کی کوشش سے اس میں غیر معمولی کامیابی ہوئی اور ہو رہی ہے۔

ان تمام مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ ہندوستانی مسلمانوں کے نزدیک اصول و صداقت پر مفاد و مصالح مقدم ہیں۔ اخلاقی معیار اور اخلاقی حقیقتیں ان کی نگاہ میں وقیع نہیں۔

اصل چیز وہ منافع اور فوائد ہیں جن کا حصول اپنی ذات، خاندان، یا قوم کے لیے ضروری یا فائدہ مند سمجھا جاتا ہے۔ یہ ذہنی کیفیت اور سیرت ایک ایسی ملت کے لیے جو پیغمبروں کی تعلیمات اور اصول کی حامل و امین ہے اور اصول و اخلاق، سیرت و کردار میں تمام دنیا کے لیے نمونہ و شاہد ہے (وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ) حد درجہ نامناسب اور غیر مطابق ہے اگرچہ ایک خالص "قوم" کے لیے بالکل مناسب اور عین مطابق ہے، اور اس کا مسلمانوں کو فیصلہ کرنا چاہیے کہ ان کی صحیح پوزیشن کیا ہے؟

یہ ذہنیت وسیرت ہمارے علم میں کم سے کم ہندوستان میں اس پچیس تیس برس کے عرصہ میں نمایاں ہوئی ہے اور اس کو بڑا فروغ اس مغربی قوم پرستی اور موجودہ سیاسی جوش اور دفاعی جذبہ نے دیا ہے جو ان پچھلے برسوں میں مسلمانوں میں پیدا ہوا ہے۔ ورنہ مسلمانوں کی پوری تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ انھوں نے اصول و اخلاق پر بڑے بڑے مصالح و منافع کو ہمیشہ قربان کیا اور ایک اخلاقی اصول یا دینی حکم کی حفاظت کے لیے انھوں نے عظیم الشان سیاسی و معاشی فوائد کو ٹھکرا دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جبلہ کے معاملہ میں ٹھیک یہی طرز عمل اختیار کیا تھا جسے ایک خالص قوم پرست کے نقطۂ نظر سے ایک بڑی سیاسی غلطی کہنا چاہیے۔ صرف ایک شرعی حکم (قصاص) اور ایک دینی اصول (مساوات) کے قائم رکھنے کی خاطر ان کو جبلہ جیسے بااثر والی ریاست اور غسان جیسے طاقتور قبیلہ کی امداد سے دستبردار ہونا پڑا مگر انھوں نے اس کے لیے اصول میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جبلہ سے ہزار درجہ بڑھ کر طاقتور فرماں روا اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے، غسان سے ہزار درجہ بڑی ریاستیں اسلام کے اثر میں آئیں اور شریعت اسلامی میں کوئی تحریف نہیں ہو سکی،

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کسی سیاسی مصلحت کی خاطر ادنیٰ درجہ کی بھی بے اصولی اور اخلاقی معیار سے انحراف قبول نہیں کیا اور اس کے لیے وہ تمام مشکلات قبول کیں جو ان کو اپنی خلافت میں پیش آئیں

مگر نظامِ خلافت میں انھوں نے کوئی تحریف نہیں ہونے دی۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کوئی سیاسی مصلحت اور قومی مفاد ایک ایسے نظامِ حکومت سے تعاون کرنے پر آمادہ نہ کر سکا جو ان کے نزدیک غلط اور ان کے اعتقاد و اصول کے خلاف تھا۔

ابھی نصف صدی پہلے جب مغربی تہذیب اور مغربی افکار ہندوستان میں مقبول نہیں ہوئے تھے ہندوستانی مسلمانوں کا کیرکٹر اتنا مضبوط تھا کہ اعلیٰ قسم کے دینداروں کے علاوہ متوسط درجہ کے بااصول اور وضعدار شرفا بھی جھوٹ بولنا، اپنے ضمیر اور اعتقاد کے خلاف کوئی کام کرنا یا کچھ کہنا کفر سے کم نہیں سمجھتے تھے اور مر جانے کو اس پر ترجیح دیتے تھے۔ بدایوں کے ایک بزرگ (غالباً مولوی رضی الدین صاحب) ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ماخوذ تھے۔ کلکٹر یا جج ان کا شاگرد تھا۔ اس نے ہزار کوشش کی کہ مولوی صاحب ایک مرتبہ اپنی زبان سے جرم کا انکار کر دیں تو وہ ان کو صاف بری کر دے گا۔ لیکن انھوں نے آخر وقت تک جھوٹ بولنے اور اپنے ضمیر اور اعتقاد کے خلاف کچھ کہنے سے انکار کیا اور سزائے موت قبول کی۔

مولانا محبوب علی صاحب دہلوی نے ہندوستان کی مشہور تحریکِ جہاد (حضرت سید احمد شہید و مولانا اسمٰعیل شہید کی تحریک) میں کچھ اختلاف کیا، بعد میں انگریزوں نے نو گاؤں صلہ میں دینے چاہے مگر انھوں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ یہ میرا اجتہاد تھا۔ میں نے کسی مصلحت سے اختلاف نہیں کیا تھا۔

یہ سینکڑوں ہزاروں میں سے دو مثالیں تھیں۔ شریف خاندانوں اور شرفا کی بستیوں میں جا کر پوچھیے تو اس قسم کی بہت سی مثالیں آپ سنیں گے۔

سیرت کی صلابت، اخلاق کی استقامت اور اصول کی پابندی کی ان مثالوں کا مقابلہ اس زمانہ کی بے اصولیوں اور اخلاقی کمزوریوں، ضمیر فروشیوں اور مسلک و خیالات کی نیرنگیوں سے کیجیے، تو آپ کو اس عام قومی انحطاط اور اخلاقی زوال کا اندازہ ہوگا جو مسلمان قوم میں نظر آرہا ہے اور روز بروز سرعت کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ یہ مسلمانوں کی زندگی کا وہ تاریک پہلو ہے جس کو دیکھ کر ایک حساس مسلمان کا

دل خون ہوتا ہے اور وہ اس تلخ نوائی پر مجبور ہو جاتا ہے جو اس کے لیے اور پڑھنے والوں کے لیے کوئی خوش گوار چیز نہیں۔

اخلاق وسیرت اس امت کے نظام جسم میں قلب کا درجہ رکھتے ہیں۔ لوگ تنومند و فربہ جسم کو دیکھکر اس جسم کی صحت وطاقت کا حکم لگا دیتے ہیں، اور یہ نہیں دیکھتے کہ قلب کس قدر کمزور اور ماؤف ہے اور کس طرح بتدریج اس کی حرکت بند ہو رہی ہے۔ مسلمانوں کی ترقی کا اندازہ مردم شماری کے اعداد، ان کے قومی جوش، ظاہری تنظیم اور سرکاری عہدوں کے تناسب سے لگانا بالکل غلط ہے۔ ایک بااصول دنیا کے لیے ایک پیغام رکھنے والی، اور اخلاق وسیرت میں دنیا کی تمام قوموں کے لیے معیار بننے والی امت کی پیمائش کا ہرگز یہ صحیح پیمانہ نہیں۔ ضرورت ہے کہ دیکھا جائے کہ وہ اخلاق و اوصاف جو زندگی کے صحیح عناصر ہیں، اور جن سے اس امت کا تشخص و امتیاز ہے وہ روبانحطاط ہیں یا روبترقی۔ اور اس کا اندازہ سرکاری کاغذات سے نہیں ہو سکتا، بلکہ مسلمانوں کی عام زندگی اور ان کے اقوال وافعال سے ہو سکتا ہے۔ بقول اکبر مرحوم:

نقشوں کو تم نہ جانچو لوگوں سے مل کے دیکھو
کیا چیز جی رہی ہے، کیا چیز مر رہی ہے

(باقی)